ہزارہ شیعہ

(تاریخ، نژاد اور مذہب)

حمزہ ابراہیم

فہرست

تاریخی ورثہ.. 3

جینیاتی ورثہ 15

مذہبی ورثہ 21

افغان طالبان کا برتاؤ 32

حوالہ جات.. 39

ہزارہ افغانستان کی آبادی کا پندرہ فیصد ہیں۔ انکا آبائی علاقہ کابل کے مغرب میں کوہِ ہندوکش کے دامن میں واقع ہے جسے ''ہزارہ جات'' کہا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ کابل اور کوئٹہ میں ہزارہ لاکھوں کی تعداد میں آباد ہیں۔ دنیا میں ہزارہ کی آبادی کا تخمینہ ساٹھ لاکھ نفوس تک لگایا گیا ہے جن میں سے اندازاً چالیس لاکھ افغانستان اور دس لاکھ پاکستان میں رہتے ہیں۔ ہزارہ کی زبان ہزارگی کہلاتی ہے جو فارسی کا ایک مشرقی لہجہ ہے جس میں ترک زبان کے اثرات بھی شامل ہیں۔ ہزارہ جینیاتی اعتبار سے چین کے صوبے سنکیانگ میں رہنے والے ایغور نسل کے لوگوں سے ملتے ہیں۔ ہزارہ مذہبی اعتبار سے شیعہ امامیہ مسلمان ہیں البتہ ان میں بہت کم تعداد شیعہ اسماعیلی اور سنی حنفی مسلک کی پیروی بھی کرتی ہے۔ عراق کے شہر نجف اشرف میں موجود چار شیعہ مراجع میں سے ایک، آیت اللہ اسحاق فیاض کا تعلق ہزارہ برادری سے ہے۔ ہزارہ تعلیم پر خصوصی توجہ دیتے ہیں اور اسی وجہ سے ان کی شرح خواندگی کافی بہتر ہے۔ صنفی مساوات کے اعتبار سے ہزارہ اس خطے کی دوسری اقوام کی نسبت بہت روشن خیال ہیں۔ ہزارہ خواتین زندگی کے ہر شعبے میں فعال کردار ادا کرتی دکھائی دیتی ہیں۔

تاریخی ورثہ

لکھی ہوئی تاریخ میں وسطی ایشیاء میں ہونے والے واقعات کا ذکر تیرہ سو قبلِ مسیح میں ملتا ہے جب ترکمانستان کے علاقے سے آریائی قبائل موجودہ ایران میں داخل ہونا شروع ہوئے اور سات سو قبلِ مسیح تک یہاں اپنی حکومت قائم کرلی۔ تب سینتھیائی، جو ہندی فارسی زبانیں بولتے تھے، شمال کی طرف بڑھے اور وسطی ایشیاء میں پھیل گئے۔ 530 قبل مسیح میں کورُوش (دوسرے نام: سائرس، ذوالقرنین) نے موجودہ ایران و عراق میں ہخامنشی سلطنت قائم کی اور موجودہ افغانستان اور پاکستان کو اس کے بیٹے دارا نے فتح کر کے ساتھ ملا لیا۔ گندھارا تہذیب کا علاقہ ہخامنشی سلطنت کا بیسواں صوبہ تھا۔ 330 قبلِ مسیح میں سکندرِ اعظم نے ہخامنشی سلطنت کو مکمل طور پر فتح کر کے سلطنتِ مقدونیہ کا حصہ بنالیا۔ اسکے بعد اس نے ہندوستان پر حملوں کا آغاز موجودہ پنجاب سے کیا جہاں اسکا مقابلہ راجہ پورس نے کیا۔ راجہ پورس کے ہاتھوں شکست یا اپنے لشکر میں بغاوت کے بعد سکندر نے واپسی کی راہ لی۔ سکندر یورپ اور ایشیاء میں ثقافتی اور معاشی تعلقات بڑھانا چاہتا تھا، چنانچہ اس نے اپنی فتوحات کے دوران مصر سے پنجاب تک کئی بستیاں بنا کر یونانیوں کو بسایا۔ سکندر کی موت کے

بعد بر صغیر کے معروف سیاسی مفکر کوٹلیا چانکیا کے شاگرد چندر گپت موریا نے شمالی ہندوستان میں موریا سلطنت کی بنیاد رکھی اور دریائے سندھ تک کا علاقہ فتح کر لیا(1)۔ 303 قبل مسیح میں شہنشاہ موریا کے یونانیوں سے کئے جانے والے جنگ بندی کے معاہدے کے تحت پانچ سو ہاتھیوں کے عوض موجودہ پاکستان اور مشرقی افغانستان کا علاقہ موریا سلطنت کا حصہ بن گیا(2)۔ 250 قبلِ مسیح میں ہزارہ جات کے یونانی گورنر تھیوڈوٹس نے سلطنتِ مقدونیہ سے بغاوت کر کے سلطنتِ باکتریا کی بنیاد رکھی۔ یہ سلطنت کوہِ ہندوکش کے شمال میں موجودہ افغانستان، تاجکستان اور ازبکستان کے سنگم پر قائم ہوئی۔ قدیم رومن مورخ جستونوس کے الفاظ میں:

Latin: “Eodem tempore etiam Theodotus, mille urbium Bactrianarum praefectus, defecit regemque se appellari iussit, quod exemplum secuti totius Orientis populi a Macedonibus defecere”.

English: “Diodotus, the governor of the thousand cities of Bactria, defected and proclaimed himself king. All the other people of the Orient followed his example and seceded from Macedonians”.

”باکتریا کے ہزار ستان کے گورنر تھیوڈوٹس نے بغاوت کر کے خود کو سلطان قرار دیا۔ اس کے بعد مشرق کے باقی لوگوں نے بھی مقدونیوں سے علیحدگی اختیار کرلی“(3)۔

تیسری صدی قبلِ مسیح کے اوائل میں وسطی ایشیاء کے خانہ بدوش گڈریوں کے سلطنتِ باکتریا پر حملے نے یونانی دور کا خاتمہ کردیا(4) ۔ یہ قبائل آگے بڑھتے ہوئے موجودہ چین کے مغربی علاقوں تک پہنچ گئے۔ 221 قبلِ مسیح میں سلطنتِ چین کے قیام کے بعد شاہراہء ریشم پر چین سے یورپ تک ریشمی کپڑے اور دیگر اجناس کی تجارت ہونے لگی، اسطرح ہزارہ جات کا علاقہ چینی تاجروں اور سیاحوں کی گذرگاہ بن گیا۔ اس کا مطلب تھا کہ نہ صرف تجارت کا

مال یہاں آنے لگا بلکہ قافلے اپنے ساتھ روم سے چین تک کے افکار بھی لائے۔ دیوارِ چین کی تعمیر کے نتیجے میں دوسری صدی قبلِ مسیح میں مشرق سے پانچ خانہ بدوش ترک قبائل نے ہجرت کر کے موجودہ افغانستان کے شمال میں سکونت اختیار کی۔ ان قبائل میں سے کوشان قبیلہ سب سے بڑا تھا اور پہلی صدی عیسوی میں اس نے سلطنتِ کوشان قائم کی جس کی سرحدیں دوسری صدی عیسوی تک پھیل کر شمالی ہندوستان اور کاشغر سے موجودہ ایران اور بحیرۂ خَزر تک پہنچ گئیں (5)۔ 226 عیسوی میں اردشیر نے ایران میں ساسانی سلطنت قائم کی۔ اس کے بیٹے شاپور نے موجودہ افغانستان اور پاکستان کا دریائے سندھ تک کا علاقہ فتح کر لیا۔ اسی دوران شمالی ہندوستان میں گپتا سلطنت قائم ہوئی جس نے برہمن تہذیب کو عروج بخشا (6)۔ ساسانی سلطنت کی توجہ شروع سے ہی اپنی مغربی سرحد پر رومی سلطنت کے ساتھ مسابقت پر مرکوز رہی اور مشرقی علاقوں میں مختلف نیم آزاد ریاستیں قائم ہوتی رہیں، جن میں بامیان کی ریاست بھی تھی۔ پانچویں صدی عیسوی میں شمال مشرق سے تاتاروں نے حملے شروع کیئے۔ انہوں نے اپنی مہم کے آغاز میں ہی باکتریا پر حملہ کر کے کوشان اقتدار کا مکمل خاتمہ کر دیا اور شمالی ہندوستان میں گپتا سلطنت کو توڑ دیا (7)۔ تاتاروں

نے کاشغر سے سیستان اور موجودہ پنجاب تک کے علاقے سے تیس کے قریب نیم آزاد سلطنتوں کو ختم کر کے یہاں پر سو سال تک حکومت کی۔ 565ء میں ساسانی فوج نے ترک قبائل کے ساتھ مل کر فیصلہ کن حملہ کیا اور تاتاروں کو اپنی سلطنت کا تابعدار بنالیا (8)۔

سن 632ء میں بامیان سے گزرنے والے چینی زائر و مؤرخ ہیون سانگ(Xuan Zang)کے مطابق یہاں کی زبان کا رسم الخط باکتریا کے دوسرے علاقوں (بلخ، بخارا، وغیرہ)جیسا تھا اور یہ لوگ جسمانی لحاظ سے بھی اُن لوگوں سے ملتے جلتے تھے۔ لیکن اِن کی بولی مختلف تھی۔ شاہراہِ ریشم کا ایک اہم تجارتی مرکز ہونے کی وجہ سے بامیان کے باسیوں کا معیارِ زندگی پڑوسیوں سے بہتر تھا(9)۔

. ساتویں صدی عیسوی میں ساسانی سلطنت کے زوال کا آغاز 622ء میں رومی سلطنت کے ہاتھوں شکست اور 628ء میں خسرو پرویز کے قتل کے بعد شروع ہونے والی سیاسی رسہ کشی سے ہوا۔ 637ء میں قادسیہ کے مقام پر مسلم لشکر کے ہاتھوں شکست کے بعد پے در پے جنگیں ہارتے ہوئے 651ء تک اس

سلطنت کا مکمل خاتمہ ہو گیا۔ حضرت علیؑ کے دور میں مسلم سلطنت کی سرحدیں خراسان اور غور کے علاقے تک پہنچ گئیں مگر وسطی ایشیاء کے باقی علاقے میں چھوٹی چھوٹی ترک سلطنتیں نمودار ہوئیں جو آپس میں سرحدی جھگڑوں میں مشغول رہیں۔ آٹھویں صدی عیسوی میں موجودہ ترکمانستان کا علاقہ بغداد کے زیرِ حکومت آ گیا اور وسطی ایشیاء میں نو مسلم صوفیاء نے اپنے سابقہ مذہب بدھ مت کے رنگ میں اسلام کی تبلیغ کا آغاز کر دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ عرب مسلمانوں کو یہاں سے کاغذ بنانے کا ہنر سیکھنے کا موقع ملا اور عباسی خلیفہ مامون الرشید کے قائم کردہ دار الحکمۃ میں یونانی اور ہندوستانی علوم کا ترجمہ ہونے لگا، جس سے مسلم دنیا میں علمی انقلاب آ گیا۔

آٹھویں صدی عیسوی میں بامیان سے گزرنے والے کوریائی سیاح ہائی چو (Hyecho) نے اپنے سفر نامے میں بامیان کو ایک آزاد مملکت بتایا ہے جس کا دفاع اتنا مضبوط تھا کہ پڑوسی ممالک اس پر حملہ کرنے کی ہمت نہیں کرتے تھے۔ اس کی ایک وجہ یہاں کا مشکل جغرافیہ اور سخت موسم بھی تھی۔ اس کے مطابق یہاں کے لوگ بدھ مت کے پیرو تھے اور آبادی کی اکثریت

پہاڑوں میں رہتی تھی۔ یہاں کے لوگوں کی بولی پڑوسی اقوام کی بولی سے الگ تھی(10)۔

نویں صدی عیسوی میں عباسی سلطنت کی گرفت کمزور پڑی اور وسطی ایشیاء میں آزاد مسلم سلطنتیں قائم ہونے لگیں۔ موجودہ افغانستان کا بیشتر علاقہ 819ء میں بخارا میں قائم ہونے والی سامانی سلطنت کا حصہ تھا۔ سامانی سلطنت کا خاتمہ 990ء میں ترکوں کے ہاتھوں ہوا جنہوں نے مذہبی طور پر تنگ نظر غزنوی سلطنت قائم کی جس نے بامیان سے بدھ، گندھارا سے ہندو اور ملتان سے اسماعیلی شیعہ اقتدار کا خاتمہ کیا۔ 1186ء میں ایک اور ترک سلطان محمد غوری نے غزنوی سلطنت کو شکست دے کر دہلی سلطنت کی بنیاد رکھی(11)۔ ترکوں نے وادیٔ بامیان میں اپنا دارالحکومت ایک نئے شہر کو بنایا جو اب شہرِ غلغلہ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ماہرین آثار قدیمہ کو اس علاقے سے صرف مسلم طرزِ تعمیر و تمدن کی باقیات ملی ہیں، جو اس بات کا ثبوت ہیں کہ یہ شہر زیادہ قدیم نہیں ہے۔ تیرہویں صدی عیسوی میں منگولیا سے اٹھنے والا منگول طوفان وسطی ایشیاء کو روندتا ہوا گذر گیا۔ شہرِ غلغلہ، جو اس وقت دارالحکومت تھا، کو منگول لشکر کی راہ میں آنے والے باقی بڑے شہروں کی طرح بری طرح تاراج

کیا گیا۔اس وقت یہاں کے حاکم سلطان جلال الدین نے فرار ہو کر موجودہ پنجاب میں پناہ حاصل کی(12)۔

چودہویں صدی عیسوی میں بامیان کچھ عرصے کیلئے ہرات کے سلطان کے ماتحت رہا مگر جلد ہی تیمور لنگ نے اس سلطنت کا خاتمہ کر دیا اور بامیان تیموری سلطنت کا حصہ بن گیا(13)۔مغلیہ سلطنت کے بانی ظہیر الدین بابر کا یہاں سے گزر ہوا اور اس نے اپنی آپ بیتی میں موجودہ ہزارہ جات کے علاقے کا نام ہزارستان لکھا ہے(14)۔

سولہویں سے اٹھارویں صدی عیسوی تک موجودہ افغانستان کا علاقہ صفوی اور مغل سلطنتوں کا حصہ رہا، پھر قندھار میں درانی سلطنت قائم ہو گئی۔ احمد شاہ ابدالی نے 1739ء میں نادر شاہ کے افغان دستے کے سالار کے طور پر دہلی لوٹا تھا،اب الگ سلطنت کا حاکم بنا تو مغلوں سے کابل، پشاور، اٹک، ملتان اور لاہور چھین لئے۔ دوسری طرف ایرانیوں سے ہرات چھین لیا اور نیشاپور میں قتلِ عام کیا۔اس نے کوہِ ہندو کش کے شمالی علاقوں کو فتح کرنے کیلئے ایک فوج روانہ کی اور ترکمن، ازبک، ہزارہ اور تاجک قبائل کو زیر کر لیا(15)۔ اگرچہ

ہندوستان پر اس کے حملے سے فائدہ اٹھا کر روہیلہ اور دوسرے شیعہ مخالف گروہوں نے دہلی میں شیعوں کو نشانہ بنایا تھا، لیکن احمد شاہ ابدالی نے اپنی سلطنت میں شیعہ قزلباش اور ہزارہ لوگوں کے خلاف مذہبی بنیادوں پر کوئی اقدام نہیں اٹھایااور ان کو اپنی فوج کا حصہ بنایا۔ 1761ء میں وہ دوبارہ دہلی آیا اور شہر کو ایسا تاراج کیا کہ اس تباہی نے ہندوستان میں انگریزوں کیلئے میدان صاف کر دیا (16)۔

1772ء میں اس کی وفات کے بعد درانی سلطنت اندرونی بحرانوں اور برطانیہ اور روس کی سرد جنگ کا شکار بن کر ٹوٹتی بکھرتی رہی۔ ہزارہ جات کا علاقہ اپنے قبائلی نظام کے ساتھ آزاد رہا۔ انیسویں صدی میں ہندوستان پر انگریزوں کا قبضہ ہوا تو ان کیلئے روس کو گرم پانیوں سے دور رکھنا اہم ترجیح بن گیا، جو وسطی ایشیاء میں تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا۔ پہلی اور دوسری برٹش افغان جنگ کے بعد انگریز کابل کے تخت کو اپنی اطاعت پر مجبور کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ 1879ء کے معاہدۂ گندمک میں یہ طے ہوا کہ افغان امیر کی سلطنت کے خارجہ امور برطانیہ کے ریذیڈنٹ افسر کے ماتحت چلیں گے۔ کرم، پشین اور سبی ہندوستان کا حصہ ہوں گے اور امیر کو ہر سال ساٹھ ہزار پونڈ کی امداد دی

جائے گی(17)۔یہ علاقے مغل سلطنت کے زوال کے بعد ابدالی نے ہندوستان سے چھینے تھے۔اب کابل کا امیر اسی طرح انگریزوں کا اتحادی بن گیا جیسے ترکی کا عثمانی سلطان بحیرۂ روم میں انگریزوں کے مفادات کا رکھوالا تھا(18)۔1880ءمیں عبدالرحمٰن خان کابل کے تخت پر بیٹھا۔اس نے اپنی جوانی اپنے جلا وطن باپ کے ساتھ بلخ میں گزاری تھی جہاں اس نے روسی افسران سے جنگ اور جدید ریاست چلانے کی تعلیم وتربیت لی تھی اور وہ انگریزوں کے مفادات کا بہترین محافظ بن گیا۔اس وقت اس کی حکومت صرف کابل کے نواح تک محدود تھی۔1881ءمیں اسکی ہرات کے فرمانروا محمد ایوب خان سے جنگ ہوئی اور ہرات فتح ہو گیا۔1886ءتک گلزئی، کنڑ، لغمان، میمنہ، شغنان وروشان، شنواری اور زورمت کو اپنی قلمرو میں داخل کر لیا(19)۔عبدالرحمٰن خان نے گلزئی پختونوں کے ہزاروں خاندانوں کو جنوبی علاقوں سے وطن بدر کر کے ہندوکش کے شمال میں بھیج دیا۔

امیر عبدالرحمٰن خان نے شیعہ مسلمانوں کی زندگیاں تباہ کرنے کیلئے ایک منظم مہم چلائی۔ان کو قتل کرنے، جیلوں میں پھینکنے، زبردستی مسلک تبدیل کرنے، جائیدادوں کو ضبط کرنے اور نوکریوں سے برخاست کرنے جیسے اقدامات

اٹھائے۔ جس کے نتیجے میں متعدد شیعہ قزلباش مشہد، پشاور اور لاہور آ گئے(20)۔ 1890ء میں عبدالرحمان خان نے ہزارہ کو کافر اور باغی قرار دیا اور اپنی فوج کو انہیں کچلنے ہزارہ جات بھیج دیا۔ کابل میں انسانوں کی خرید و فروخت کا بازار لگا کر ہزارہ بچوں کو غلام اور خواتین کو لونڈیاں بنا کر بیچا۔ ہزاروں انسان قتل اور لاکھوں بے گھر ہوئے۔ ایسے میں جو ہزارہ مہاجر بن کر عبدالرحمٰن خان کی سلطنت کی سرحدوں سے نکل سکتے تھے وہ کوئٹہ یا مشہد چلے گئے۔ اس کے بعد امیر نے 1896ء میں کافرستان کے علاقے پر حملہ کر کے وہاں صدیوں سے آباد غیر مسلم آبادی کو زبردستی مسلمان بنایا اور علاقے کا نام نورستان رکھ دیا(21)۔

(THE ARGUS LONDON AGENCY.)

AFFAIRS IN AFGHANISTAN.

THE LATE HAZARA RISING.

TEN THOUSAND CAPTIVES SOLD BY THE AMEER.

LONDON, Oct. 19.

Last year a serious rising broke out among the Hazaras, an Afghan tribe, against the Ameer, Abdur Rahman. After a good deal of fighting the insurrection was suppressed, a number of the rebels being taken prisoners by the Ameer's troops.

Advices from Cabul state that the Ameer has sold 10,000 of the captive Hazaras as slaves in order to defray the expenses incurred in suppressing the rising.

Ref: English Newspaper "The Argus", Friday 20 Oct 1893, Page-5.

1901ء میں اس کی وفات کے بعد حبیب اللہ خان اس کے تخت پر بیٹھا، جس نے جنگ عظیم اول میں ترکی اور جرمنی کا ساتھ دینے کے نام پر ان سے اسلحہ اور رقم لی مگر ہندوستان میں تحریکِ ریشمی رومال جیسے بے ضرر اور نمائشی اقدامات سے آگے نہ بڑھا(22)۔ 1919ء میں اس کے قتل کے بعد اس کا بیٹا امان اللہ خان بادشاہ بنا جس نے جنگ عظیم دوم کے تھکے ہوئے برطانیہ کے خلاف جنگ کر کے آزادی حاصل کی اور 1923ء میں اس خطے کی تاریخ کا پہلا آئین بنا کر ایک آزاد قومی ریاست قائم کی اور یوں موجودہ افغانستان نامی ملک وجود میں آیا(23)۔ ایک سیکولر بادشاہ کے طور پر اس نے ہزارہ کو غلامی سے آزادی دی اور ان کے انسانی حقوق کو بحال کیا۔ اسی وجہ سے جب 1929ء میں اس کے خلاف تکفیری علماء نے جہاد کا اعلان کر کے بچہ سقہ کے نام سے جانے والے ایک دیوانے کو کابل کے تخت پر بٹھایا تو ہزارہ جات کے باسیوں نے اس کے بھیجے ہوئے لشکر کو شکست دے کر بھگا دیا(24)۔

ہنگاموں سے بھرپور ماضی نے افغانستان کے جینیاتی ورثے کو بہت متنوع بنا دیا ہے۔

جینیاتی ورثہ

انسانی ارتقاء اور جینیات کا علم ہمیں یہ بتاتا ہے کہ تقریباً ایک لاکھ سال پہلے انسانوں کا ایک چھوٹا سا گروہ مشرقی افریقہ سے ہجرت کر کے مغربی ایشیاء میں آیا اور انکی اولاد اگلے ہزاروں سالوں میں دنیا بھر میں پھیل گئی۔ ان کے پاس قوتِ گویائی تھی اور انہوں نے ان علاقوں میں رہنے والے انسان نما جانداروں سے جہاں جینیاتی ورثے کا تبادلہ کیا وہیں ایک رقیب کے طور پر ان کے خاتمے کا بندوبست بھی کیا اور چالیس ہزار سال پہلے دس کے قریب ایسے مختلف جانداروں، جن میں نینڈر تھال اور ہوموا یرا کٹس قابلِ ذکر ہیں، کا خاتمہ ہو گیا۔ اس دوران انسانوں میں معمولی جینیاتی تبدیلیاں بھی رونما ہوتی رہیں جن کی وجہ سے مختلف نسلی گروہ سامنے آتے گئے۔

فروری دو ہزار آٹھ میں معروف تحقیقی جریدے ''سائنس'' میں شائع ہونے والے مقالے

"Worldwide Human Relationships Inferred from Genome-Wide Patterns of Variation"

میں دنیا کے مختلف علاقوں میں بسنے والے لوگوں کے جینیاتی مواد پر کی جانے والی مفصل سائنسی تحقیق کے نتائج پیش کئے گئے(25)۔اس تحقیق کا مقصد اکیاون مختلف نسلی آبادیوں کی گروہ بندی کرنا تھاتا کہ ان اقوام کے نسلی ورثے کو سمجھنے میں مدد مل سکے۔ اس مطالعے کے نتیجے میں ہزارہ اور سینکیانگ (کاشغر) کے ایغور جینیاتی اعتبار سے ایک گروہ میں نظر آئے۔اس گروہ میں شامل باقی نسلیں بروشو، کالاش، پختون، پنجابی و سندھی، مکرانی، براہوی اور بلوچ تھیں۔ ان میں یورپی اور جنوب مشرقی ایشیاء کی اقوام کے جینز چند ہزار سال پہلے ان علاقوں سے آنے والے لوگوں کے ساتھ ہونے والے ارتباط کا نتیجہ ہیں۔ دوسری طرف منگول جینیاتی اعتبار سے اروکن، یاکوت، ہان (چینی)، جاپانی، کمبوڈین اور مشرقِ بعید سے تعلق رکھنے والی باقی نسلوں کے گروہ میں شامل نظر آئے۔

اس کے بعد سن دو ہزار دس میں وسطی ایشیاء کی چھ مختلف نسلوں سے تعلق رکھنے والی چھبیس آبادیوں پر کی جانے والی جینیاتی تحقیق ''یورپین جنرل آف ہیومن جنیٹکس'' میں شائع ہوئی۔ مقالے کا عنوان تھا:

“In the heartland of Eurasia: the multilocus genetic landscape of Central Asian populations” (26).

اور اس تحقیق کا محور وسطی ایشیاء کے علاقے سے تعلق رکھنے والی چھبیس مختلف آبادیاں تھیں۔ اس مطالعے کے نتیجے میں بھی یہی بات سامنے آئی کہ ہزارہ اور ایغور کا جینیاتی ورثہ منگولوں کے بجائے وسطی ایشیاء ہی کی دوسری اقوام سے ملتا ہے۔ ہزارہ اور ایغور جینیاتی فاصلے کے اعتبار سے ازبک، تاجک، کرغز اور کازک لوگوں کے قریب اور منگولوں سے دور ہیں۔ ان تحقیقات سے یہ بات سامنے آئی کہ جغرافیائی اعتبار سے قریب رہنے والی اقوام جینیاتی اعتبار سے بھی قریب تھیں اور یہ خیال کہ منگولوں نے ہزارہ جات کی ساری مقامی آبادی کو ختم کر کے وہاں اپنے لوگ بسائے تھے، غلط تھا۔

اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہزارہ چنگیزی نہیں ہیں بلکہ جن علاقوں پر افغانستان قائم ہوا، ان کے قدیم اور اصلی باشندوں میں سے ہیں۔ یہ مفروضہ کہ منگولوں نے کسی علاقے کی آبادی کا مکمل خاتمہ کیا ہو، آثارِ قدیمہ کے مطالعے

سے بھی ثابت نہیں ہو سکا ہے کیونکہ کسی بڑے علاقے میں ہزاروں سر بریدہ یا بدن دریدہ ڈھانچے نہیں ملے ہیں جن کی کاربن ڈیٹنگ انہیں منگولوں کے دور سے منسوب کرتی ہو۔ اگرچہ منگول لشکر اپنے راستے میں آنے والے بڑے شہروں کو تباہ کرتا رہا لیکن اس دور میں کسی شہر کی تمام آبادی، اس کے گرد و نواح کے دیہاتوں اور ہزارہ جات کے وسیع علاقے میں پھیلے دیہاتوں اور خانہ بدوش آبادیوں کی نسل کشی ممکن نہ تھی کیونکہ یہ کام جدید اسلحے اور انجن کے زور پر بھی نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اس بات کی کوئی عقلی توجیہ بھی ممکن نہیں ہے کہ منگول لشکر نے اپنی فوج کے ایک حصے کو اپنے آبائی علاقے سے ہزاروں میل دور ہزارہ جات کے علاقے میں بسایا ہو مگر کسی اور جگہ ایسی آبادکاری کا اہتمام نہ کیا ہو، جبکہ ان کی عسکری مہم ایشیاء اور یورپ کے وسیع علاقوں پر پھیلی ہوئی تھی اور انہیں آگے جانے کیلئے افرادی قوت بھی درکار تھی۔

انسانوں کے کسی گروہ کی شناخت میں ایک اہم عنصر مادری زبان ہوتا ہے۔ انسان اپنے بچپن میں اپنے والدین اور قریبی لوگوں کی آواز اور برتاؤ سے مادری زبان سیکھتا ہے۔ اگرچہ آج کی دنیا میں جدید وسائل کی مدد سے کسی بچے کو دوسری زبانیں سکھانا ممکن ہے اور بعض اوقات والدین بچوں کو اپنی مادری

زبان کے بجائے کوئی اور زبان سکھا دیتے ہیں، جیسے پاکستان میں اردو یا انگریزی، لیکن ماضی میں انسانی معاشروں میں روابط اتنے تیز نہ تھے۔ چنانچہ لوگوں کی مادری زبانیں کئی ہزار سال گزارنے کے بعد آنے والی تبدیلیوں کے باوجود زبانوں کے اسی خاندان میں رہی ہیں جن سے انکا جینیاتی تعلق ہے۔ مثلاً ہزاروں سال پہلے جغرافیائی طور پر بچھڑنے والے آریائی لوگ ایران و برصغیر میں ہوں یا یورپ میں، انکی زبانیں اپنے جوہر میں باقی آریائی زبانوں سے ملتی جلتی ہیں۔ دوسری طرف آریا اور دراوڑ نسلوں کے لوگ ہندوستان میں کئی ہزار سال سے جغرافیائی طور پر اکٹھے رہ رہے ہیں لیکن دراوڑی زبانوں کا تعلق الگ لسانی گروہ سے ہے۔ ہزارہ کی زبان بھی آریائی زبانوں میں شمار ہوتی ہے لیکن منگول زبان آریائی نہیں ہے۔ منگولوں نے باقی حملہ آوروں کی طرح ہزارہ پر بھی اتنے ہی جینیاتی اور لسانی اثرات چھوڑے جتنے باقی اقوام پر چھوڑے ہیں۔

بامیان میں مہاتما بدھ کے مجسمے ہزارہ کا اہم تاریخی ورثہ اور سیاحتی قدر تھے۔ ماضی میں مختلف مسلمان حملہ آور بامیان میں مہاتما بدھ کے مجسمے کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتے رہے۔ سب سے پہلے بابر اور پھر اورنگزیب اور اس کے بعد نادر شاہ نے بت شکنی کے نام پر اس تاریخی شناخت کو ختم کرنا چاہا۔

اورنگزیب و نادر شاہ کی توپیں ان کو صرف معمولی نقصان پہنچا سکیں۔ 1891ء میں امیر عبدالرحمٰن خان نے نسبتاً جدید اسلحے سے گولہ باری کر کے ان مجسموں کے چہروں کو مسخ کر دیا، جن میں ان کو بنانے والے ہزارہ کے چہروں کا عکس اس زمین پر ہزارہ کے تاریخی حق کو ثابت کرتا تھا۔ مارچ 2001ء میں ملا عمر نے بارود نصب کروا کے دونوں مجسموں کو تباہ کر دیا۔ اس سے بامیان کی سیاحتی قدر و قیمت گر گئی اور اس کی تاریخ کے ایک اہم باب کے مادی آثار نہ رہے۔

مذہبی ورثہ

ماہرینِ آثارِ قدیمہ کے مطابق ازمنۂ قبلِ تاریخ میں وسطی ایشاء کے لوگ بکری کی پوجا کرتے تھے(27)۔تاریخ کے ابتدائی عرصے میں وسطی ایشیاء کے لوگ زرتشت (پارسی) مذہب کے پیروکار ہو گئے تھے، جسے ہخامنشی سلطنت نے رواج دیا تھا(28)۔ سکندر کی طرف سے یونانیوں کو مشرق میں بسانے اور تہذیبوں کو ملانے کی کوشش نے وسطی ایشیاء میں یونانی خیالات اور فنون، جیسے مجسمہ سازی، کو رواج دیا۔ تیسری صدی قبلِ مسیح میں شہنشاہ چندر گپت موریا کے پوتے اَشوکِ اعظم نے اڑیسہ میں ہونے والی خونی لڑائی کے بعد توبہ کر کے بدھ مت کو اپنا لیا تھا۔ 250 قبلِ مسیح میں موجودہ ہندوستانی صوبہ بہار کے علاقے میں بدھ مت کی تیسری شوریٰ کا اکٹھ ہوا جس میں مختلف علاقوں میں بدھ مت کے مبلغین بھیجنے کا فیصلہ کیا گیا جس کے نتیجے میں چند صدیوں میں ایشیاء کا وسیع علاقہ بدھ مت کا پیرو بن گیا(29)۔ اَشوک نے سلطنت کے مختلف حصوں میں مینار بنوا کر ان پر بدھ مت کی تعلیمات بھی کندہ کرائیں۔ موجودہ افغانستان میں بدھ مت موریا سلطنت کے زیر سایہ متعارف ہوا۔

قندھار کے علاقے شہرِ کہنہ سے پتھر کے کتبوں پر آشوک کے کئی فرامین ملے ہیں جن میں سے ایک پر لکھی تحریر کا جو حصہ باقی بچا ہے اس کا ترجمہ یہ ہے:

''تقویٰ اور ضبطِ نفس ہر مسلک کی تعلیمات کا حصہ ہے۔ جو شخص اپنی زبان پر قابو رکھتا ہے وہ اپنے نفس کا حاکم ہے۔ انہیں نہ اپنے بارے میں شیخیاں بگھارنی چاہئیں نہ اپنے پڑوسی کو کسی حوالے سے کمتر سمجھنا چاہئیے، کیوں کہ یہ ایک فضول کام ہے۔ اس اصول پر کاربند رہ کر وہ اپنی عزت بڑھا اور اپنے پڑوسیوں کے دل جیت سکتے ہیں۔ ان اصولوں سے رو گردانی کرنے والے اپنی عزت گنّوا بیٹھتے ہیں اور پڑوسیوں کو اپنا دشمن بنا لیتے ہیں۔ اپنی بڑائی بیان کرنے اور اپنے ارد گرد کے لوگوں کو پست کہنے والے لوگ خود پرستی میں مبتلا ہیں، جو دوسروں کے مقابلے میں برتر دکھائی دینے کی کوشش میں اپنا ہی نقصان کر رہے ہیں۔ شائستہ یہی ہے کہ آپس میں عزت سے پیش آیا جائے اور ایک دوسرے سے سیکھا جائے۔ ہر معاملے میں دوسروں کی بات کو سمجھنے کیلئے تیار ہونا چاہئیے اور دوسروں کو وہ بات سمجھانے کی کوشش بھی کرنی چاہئیے جسے وہ سمجھ سکتے ہوں۔ وہ لوگ جو اس راہ پر قدم بڑھانے کی کوشش کرتے ہیں، وہ یہ پیغام

آگے پہنچانے میں کسی تردد کا شکار نہیں ہوں گے یہاں تک کہ ہر طرف تقویٰ اور نیکی کا بول بالا ہو جائے۔

پادشاہ نے اپنی حکومت کے آٹھویں سال کالینگاہ کو فتح کیا۔ ڈیڑھ لاکھ انسان یا تو قیدی بنے یا بے دخل کئے گئے۔ ایک لاکھ لوگ قتل ہوئے اور اتنے ہی اس جنگ کے اثرات کی وجہ سے جان کی بازی ہار گئے۔ اس پر رحم اور ہمدردی کے جذبات نے غلبہ پالیا اور اس کو بہت دکھ ہوا۔ یہاں تک کہ اس نے کسی ذی روح کو قتل کرنے پر پابندی لگادی اور نیکی کو عام کرنے کی ٹھان لی۔ اسی دوران اس نے وہاں رہنے والے برہمنوں اور سرمنوں کی ریاضت کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا۔ انہیں بادشاہ کے مصالح کا خیال رکھنا چاہیئے، اپنے اساتذہ، باپ اور ماں کا ادب و احترام بجالانا چاہیئے۔ اپنے دوستوں سے محبت اور وفاداری کا برتاؤ کرنا چاہیئے۔ انھیں اپنے غلاموں اور وابستگان کے ساتھ جتنا ممکن ہو اچھا سلوک کرنا چاہیئے۔ اگر وہاں مصروفِ کار افراد میں سے کوئی انتقال کر جائے یا بے دخل کیا گیا ہو اور دوسرے لوگ اس کو معمولی حادثہ سمجھیں، تو یہ امر بادشاہ کو ناگوار گزرتا ہے۔ ان کے علاوہ دوسرے لوگوں میں۔۔۔۔"۔

یہ فرمان دو زبانوں، آرامی اور یونانی میں لکھا گیا ہے۔ آرامی زبان کو ہخامنشی سلطنت نے اور یونانی کو سلطنتِ مقدونیہ نے اس علاقے میں رواج دیا تھا۔ اسی قسم کے کتبے جلال آباد اور ٹیکسلا میں بھی ملے ہیں جو آرامی اور سنسکرت زبان میں لکھے گئے تھے (30)۔ یہاں مسلک سے مراد بدھ مت کے مختلف فرقے ہیں۔ کالینگاہ (موجودہ اڑیسہ) کی فتح کے ذکر میں لاکھ کا ہندسہ مبالغے کیلئے استعمال ہوا ہے، ورنہ اس زمانے میں ہندوستان کی مجموعی آبادی ہی چند لاکھ نفوس پر مشتمل تھی۔ یہاں ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ اخلاقیات اور اچھے کردار کو خداپرستی سے مشروط نہیں کیا گیا۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ بدھ مت میں دیوتا یا معبود کا کوئی تصور نہیں ہے۔ اسی طرح آخرت، قیامت اور عالمِ بالا کا بھی کوئی تصور نہیں ہے، اس کے بجائے وہ تناسخ، یعنی دوسرے جنم پر یقین رکھتے ہیں۔ چنانچہ اخلاقیات کا مقصد خدا کی خوشنودی کا حصول نہیں بلکہ مادی زندگی کے معیار کو بلند کرنا ہے۔ اسی طرح بدھ کو خدا کا بھیجا ہوا پیام بر نہیں بلکہ ایک روشن ضمیر انسان (مہاتما) مانا جاتا ہے۔

اگرچہ اَشوک کی وفات کے بعد موریا سلطنت زوال کا شکار ہو گئی لیکن ایشیاء میں بدھ مت تیزی سے پھیلتا رہا۔ پہلی صدی عیسوی میں قائم ہونے والی سلطنتِ

کوشان اور شاہراہِ ریشم پر ہونے والی تجارت نے بدھ مت کے پیغام کو بحیرۂ خزر سے چین و جاپان تک پھیلانے میں اہم کردار ادا کیا۔ دوسری صدی عیسوی میں بدھ مت کے رہنماؤں کی چوتھی شوریٰ کشمیر میں طلب کی گئی جس کی سربراہی کوشان شہنشاہ کَنِشک نے کی۔ اس شوریٰ نے بدھ مت کے کئی نئے مسالک کو رسمی طور پر قبول کیا اور وسطی ایشیاء میں بدھ مذہب کو عام کرنے کا منصوبہ بنایا (31)۔ بامیان و کابل کا علاقہ بدھ مت کے پیروکاروں کا روحانی و تخلیقی مرکز بن گیا۔ گندھارا کے فن پارے ایک معنوی کہکشاں کی موجودگی کا پتا دیتے ہیں۔ کوشان سلطنت کے زوال کے بعد ساسانیوں نے وسطی ایشیاء میں دوبارہ زرتشت مذہب کو رواج دیا اور بدھ مت کے بارے میں مختلف نیم آزاد سلطنتوں کا رویہ مختلف رہا۔ باقی علاقوں میں بدھ مت زوال کا شکار ہو گیا لیکن بامیان اور وادئ سندھ میں بدھ مت کی شمع پوری آب و تاب سے جلتی رہی۔ ماہرینِ آثارِ قدیمہ کے مطابق بامیان میں پہاڑ کو تراش کر بنائے گئے مہاتما بدھ کے معروف مجسمے تیسری اور پانچویں صدی عیسوی میں بنائے گئے (32)۔ ان کو تراشنے کا مقصد پوجنا نہیں بلکہ مہاتما بدھ کو خراجِ تحسین پیش کرنا تھا۔ سن 400ء میں بامیان یا کاشغر سے چینی بدھ صوفی فاھیان کا گذر ہوا۔ اس نے

بادشاہ کے دربار میں منعقد ہونے والی ایک مذہبی تقریب میں ایک ہزار کے قریب بدھ صوفیا کی شرکت کا ذکر کیا ہے (33)۔

اگرچہ علم ہمیشہ آگے بڑھتا ہے لیکن انسانی تاریخ ہمیشہ آگے نہیں بڑھتی۔ 430ء میں تاتدوں کے حملے کے آغاز اور 484ء میں ساسانی فوج کی حتمی شکست کے بعد سو سال تک سابقہ سلطنتِ کوشان کے علاقے پر تاتد اقتدار سلطنتِ کوشان کی تہذیب پروری کے برعکس وحشت اور جہالت کا راج ثابت ہوا۔ انہوں نے اپنے زیرِ تسلط علاقے میں بدھ مت کا بڑی حد تک خاتمہ کر دیا(34)۔ لیکن 565ء میں ساسانیوں کے فیصلہ کن حملے اور تاتد اقتدار کے خاتمے کے بعد بامیان پر ایک آزاد سلطنت قائم ہوئی۔ گندھارا میں برہمنوں نے تاتدوں کے ساتھ تعاون کیا تھا اور ان کے اقتدار کے خاتمے کے بعد یہاں برہمن اقتدار دوبارہ سے قائم ہو گیا۔ لیکن چونکہ برہمن ذات پات پر یقین رکھتے تھے اور اپنے مذہب میں کسی دوسری ذات کے لوگوں کو شامل کرنے کے قائل نہ تھے لہٰذا عوام کی اکثریت بدھ مت ہی کی پیروکار رہی۔

سن 632ء میں بامیان سے گزرنے والے بدھ سالک اور مؤرخ ہیون سانگ (Xuan Zang) نے یہاں بدھ مت کے ہزاروں پیروکاروں، دسیوں معبدوں اور پہاڑ میں بنائے گئے مہاتمابدھ کے کئی فٹ بلند مجسموں کی موجودگی کا ذکر کیا ہے۔ اسکی روداد سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ شہر دوبارہ ایک تجارتی مرکز بن چکا تھا اور یہاں پڑھنے لکھنے والے لوگ بھی موجود تھے (9)۔

موجودہ افغانستان میں اسلام حضرت علیؑ کے دور میں آیا جب غوری قبائل کے سربراہ مہاوی سوری نے ایک وفد کے ہمراہ کوفہ کا دورہ کیا اور حضرت علیؑ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ طبری نے اس حوالے سے دو روایات بیان کی ہیں۔ پہلی روایت میں وہ ابو جعفر سے نقل کرتے ہیں کہ جنگِ صفین کے دوران مہاوی حضرت علیؑ سے ملنے آئے اور امن معاہدہ کرنے بعد خراسان واپس لوٹ گئے۔ دوسری روایت میں ابنِ اسحاق سے نقل کرتے ہیں کہ مرو کے گورنر مہاوی جنگ جمل کے بعد حضرت علیؑ سے ملنے آئے اور حضرت علیؑ نے مرو میں موجود مسلمان لشکر کے سالار کے نام خط میں حمد و ثنا کے بعد لکھا:

"غور کے والی مہاوی سے میری ملاقات ہوئی ہے اور میں اس سے راضی ہوں۔ یہ خط 36 ہجری میں لکھا گیا"(35)۔

خراسان کے لوگ محبِ اہلبیتؑ تھے۔ جب بنی امیہ کی حکومت میں تمام علاقوں میں حضرت علیؑ کو گالیاں دینے کا حکم دیا گیا تو یہ واحد خطہ تھا جہاں کے لوگوں نے اس حکم کو ماننے سے انکار کر دیا(36)۔ بعد میں بنی امیہ کے زوال میں اسی خطے سے اٹھنے والے ابو مسلم خراسانی نے اہم ترین کردار ادا کیا۔

آٹھویں صدی عیسوی میں بامیان آنے والے کوریائی سیاح ہائی چو (Hyecho) نے بامیان کو بدھ مت کا ثقافتی مرکز بتایا ہے(10)۔ البتہ دسویں صدی عیسوی کے دوران وسطی ایشیاء میں اسماعیلی شیعہ داعی بہت متحرک تھے اور انہوں نے ہزارہ علاقوں میں شیعہ اسلام کی اسماعیلی شاخ کے منظم فروغ میں کلیدی کردار ادا کیا۔ موجودہ افغانستان کے علاقوں میں پہلی اسماعیلی تبلیغی مہم غیاث نامی ایک اسماعیلی داعی کے نویں صدی عیسوی کے آخر میں فارس سے بالا مرغاب کے علاقے میں آنے سے شروع ہوئی۔ بعد میں ناصر خسرو نے اسماعیلی دعوت کو خراسان میں منظم کیا جس کے آثار آج تک

باقی ہیں۔ ناصر خسرو یہاں کی بولی (ہزارگی/دڑی) کے شاعر اور نثر نگار بھی تھے(37)۔

بامیان سے بدھ سلطنت کا خاتمہ گیارہویں صدی عیسوی میں غزنوی سلطنت کے ہاتھوں ہوا، جو پورے شد و مد سے سنی حنفی اسلام کو پھیلانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس سیاسی غلبے نے شمالی ہندوستان کی طرح یہاں بھی اسلام کے فروغ میں کردار ادا کیا۔ڈاکٹر مبارک علی لکھتے ہیں:

''ہندوستان میں اسلام سیاسی حکومت قائم ہونے کے بعد پھیلا۔لوگ اس لئے مسلمان ہوئے کہ اپنی جاگیریں اور مراعات کو محفوظ کر لیں، یا اس لئے کہ انہیں حکومت کی ملازمتیں مل جائیں۔ نچلی ذات کے لوگ اس امید پر مسلمان ہوئے کہ شاید نئے معاشرے میں انہیں سماجی طور پر عزت مل جائے۔کچھ لوگ اسلامی تعلیمات سے متاثر ہو کر بھی مسلمان ہوئے۔ یہ بھی دستور تھا کہ اگر سیاسی قیدی مذہب بدل لیتے تو انہیں معافی دے دی جاتی تھی۔ اس لئے مقامی آبادی آہستہ آہستہ کافی تعداد میں مسلمان ہوئی''(38)۔

''سندھ میں اسلام پھیلنے کی وجہ یہ تھی کہ یہاں مسلمانوں کی آمد کے وقت اکثریت بدھ مت کی ماننے والی تھی۔ بدھ مت ایک فلسفیانہ طرز کا مذہب ہے، جس میں وسعت و کشادگی اور رواداری ہے۔ اس کے مقابلے میں شمالی ہندوستان میں ہندو مذہب کا زور تھا جسے صدیوں کی روایات نے انتہائی پختہ بنا دیا تھا۔۔۔۔ سندھ اور شمالی ہندوستان میں ایک فرق یہ بھی تھا کہ سندھ میں قبائلی نظام تھا اور برہمن ذات کو غلبہ حاصل نہیں تھا۔ اس لئے جب قبیلے کا سردار مسلمان ہو جاتا تو پورا قبیلہ اسلام قبول کر لیتا تھا''(39)۔

1306ء میں ہلاکو خان کے پڑپوتے غزن خان نے شہزادوں سمیت اسلام قبول کر لیا۔ وہ شیعہ اسلام میں کافی دلچسپی رکھتا تھا اور آئمہ اہلبیتؑ کے مزارات کی زیارت کرنے جایا کرتا تھا۔ اس کے بعد اس کے بیٹے الجائتو نے بھی اس علاقے میں شیعیت کی سرپرستی کی۔ ہزارہ قبائل کا شیعہ اسلام کی جانب مائل ہونا غزن خان کے زمانے میں شروع ہوا اور یہ سلسلہ شاہ عباس صفوی کے دور میں مکمل ہوا۔ پشتون اور سنی امیروں کی حکومت میں ہزارہ اثنا عشری اور اسماعیلیوں کو جبر و ستم کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ امیر عبدالرحمن خان نے 1891ء

سے 1893ء کے دوران اور افغان طالبان نے اپنے دورِ حکومت میں
افغانستان کی شیعہ ہزارہ آبادی کو بدترین مظالم کا نشانہ بنایا(37)۔

افغان طالبان کا برتاؤ

افغان طالبان کے برتاؤ کے بارے میں احمد رشید نے اپنی کتاب ''طالبان'' میں بامیان پر ہونے والے حملے کی روداد لکھی ہے۔

بامیان 1998: وسطی افغانستان میں ہزارہ قبیلے کے علاقے ہزارہ جات میں درجۂ حرارت نقطۂ انجماد سے گر چکا تھا۔ ہزارہ جات کا صرف دس فیصد رقبہ قابلِ کاشت ہے۔ اس سال گندم اور باجرے کی فصل اچھی نہیں ہوئی تھی۔ اگست 1997 سے طالبان نے جنوب مغرب اور مشرق کی طرف کے سارے راستے بند کر دیئے تھے۔ ہزارہ تک کوئی چیز نہیں پہنچ رہی تھی، شمال کی طرف سے کسی قسم کی امداد کا ملنا محال تھا۔ سرما کی برفباری نے بامیان تک خوراک کی رسائی میں رکاوٹ پیدا کر دی تھی۔ اقوام متحدہ اور عالمی فوڈ پروگرام نے طالبان سے امدادی قافلے گزارنے کیلئے اجازت چاہی لیکن طالبان نے انکار کر دیا۔ طالبان خود تو پاکستان سے ساٹھ ہزار ٹن گندم حاصل کر چکے تھے لیکن انہوں نے انسانی بنیادوں پر بامیان تک غذا کی رسائی کیلئے اقوام متحدہ کی امدادی ٹیموں

کو گزرنے نہ دیا۔ گزشتہ بیس سال سے جاری افغان جنگ میں یہ پہلی بار ہوا تھا کہ کوئی فریق خوراک کو جنگی ہتھیار کے طور پر استعمال کر رہا ہو۔

ہزارہ جات کے علاقے 1893ء تک آزاد اور خود مختار تھے۔ پشتون حکمران امیر عبدالرحمٰن خان، جو مذہبی سوچ رکھتا تھا، نے اس علاقے کو فتح کیا تو یہاں بسنے والے ہزارہ شیعوں کی نسل کشی شروع کر دی۔ ہزاروں کی تعداد میں لوگوں کا قتل ہوا اور ہزاروں لوگوں کو غلام اور لونڈیاں بنا کر کابل میں بیچا گیا۔ تیس سے چالیس لاکھ ہزارہ افغانستان کی سب سے بڑی شیعہ آبادی ہیں۔ طالبان انہیں منافق ، باغی اور اسلام سے خارج سمجھتے ہیں۔ایک اور بات جو طالبان کیلیئے ناقابل برداشت ہے وہ ہزارہ خواتین کا مردوں کے شانہ بشانہ اہم سیاسی، سماجی اور دفاعی ذمہ داریوں پر فائز ہونا ہے۔ اس وقت ہزارہ کی حزب وحدت کی اسی رکنی مرکزی کونسل میں بارہ خواتین شامل تھیں۔ کابل کے طالبان حکمرانوں کے تسلط، بدسلوکی اور تعصب کے باوجود ہزارہ اب جاگنے اور آگے بڑھنے لگے تھے۔ مئی میں طالبان نے مزار شریف پر حملہ کیا تو ان کو شکست دینے میں ہزارہ کا بھی کردار تھا۔ اکتوبر 1997ء میں انہوں نے طالبان کا حملہ کامیابی سے پسپا کیا۔ بامیان پر طالبان کا ایک کے بعد دوسرا حملہ ناکام ہو

گیا تھا۔ ہزارہ نے محسوس کیا تھا کہ ان کی پشت پر کوہ ہندوکش اور سامنے طالبان تھے جن کا مددگار پاکستان تھا، ان کے پاس ڈٹ جانے کے سوا کوئی راستہ بھی نہیں تھا۔

طالبان نے کابل میں اسلامی قوانین کا نفاذ کیا جس کی عالمی سطح پر بہت مذمت ہوئی۔ اعضاء کاٹ ڈالنا، کوڑے مارنا، عورتوں کو سنگسار کرنا، کابل اور قندھار کا معمول بن چکا تھا۔ طالبان نے داڑھیوں کا سائز متعین کیا، کوئی شخص اس سے کم سائز کی داڑھی نہیں رکھ سکتا تھا۔ نومولود بچوں کے نام کے انتخاب میں طالبان سے منظوری لینا ہوتی تھی۔ طالبان نے کابل میں لڑکیوں کے سکول ختم کر دیئے۔ عورتوں کو گھروں میں بند رہنے کا حکم دے دیا گیا۔ کھڑکیوں کو کالا رنگ کرنے کا حکم ہوا تاکہ باہر نہ دیکھ سکیں۔

طالبان نے پاکستان اور سعودی عرب سے کہا کہ وہ شمال پر حملے کیلئے انکی مدد کریں۔ سعودی انٹیلی جنس کے سربراہ ترکی الفیصل جون میں قندھار گئے جس کے بعد طالبان کو مالی امداد اور چار سو ٹویوٹا پک اپ گاڑیاں دیں۔ پاکستان کی آئی ایس آئی نے طالبان کو لاجسٹک سپورٹ مہیا کرنے کیلئے دو سو ارب روپے

مختص کئے۔ حملے کی تیاری میں مدد کیلئے آئی ایس آئی کے افسر اکثر قندھار جاتے رہتے تھے۔ پاکستان میں افغان مہاجر کیمپوں، سپاہِ صحابہ اور دیوبندی مدارس سے ہزاروں دہشتگرد طالبان میں شامل ہونے لگے۔ یہ دیکھ کر روس اور ایران نے ہزارہ اور ساتھ ساتھ احمد شاہ مسعود کو اپنے دفاع کیلئے اسلحہ دینا شروع کر دیا۔

جولائی میں طالبان نے ہرات کے شمال کی طرف پیش قدمی شروع کی اور دوستم کی فوج کو شکست دے کر 12 جولائی 1998ء کو مائی مانا پر قبضہ کر لیا۔ یہاں ایک سو ٹینک اور ٹرک ان کے قبضے میں آ گئے اور آٹھ سو ازبک سپاہی جنگی قیدی بنے جنھیں طالبان نے قتل کر دیا۔ یکم اگست کو طالبان نے شبرغان میں دوستم کے ہیڈ کوارٹر پر قبضہ کر لیا اور وہ ترکی فرار ہو گیا۔ اب ہزارہ کو بچانے کیلئے پندرہ سو ہزارہ سپاہی اکیلے ہو گئے۔ وہ آخری دم تک لڑے اور جب انکا اسلحہ ختم ہوا تو صرف سو فوجی رہ گئے تھے۔ صبح دس بجے ہزارہ فوجیوں کو شکست ہوئی تو مزار شریف کے شہریوں کو اسکی خبر نہ تھی۔ طالبان کو پچھلی جنگوں میں جو نقصان اٹھانا پڑا تھا اسکا بدلہ نہتے شہریوں سے لینا شروع کیا۔ ایک طالبان کمانڈر نے بعد میں بتایا کہ ملا عمر نے انہیں دو گھنٹے تک قتل عام کی اجازت دی تھی اور انہوں

نے دو دن تک اس سلسلے کو جاری رکھا۔ طالبان اپنی پک اپ گاڑیوں میں ادھر ادھر پھرتے اور قتل عام کرتے رہے۔ دکاندار، ریڑھی بان، عورتیں، بچے، گاہک، حتی بھیڑ بکریاں اور گدھے تک گولیوں سے بھون دیئے گئے۔ گلیوں میں ہر طرف لاشیں بکھری ہوئی تھیں اور خون نے ہر شے کو ڈھانپ لیا تھا۔ اسلام میں میتوں کو بلاتاخیر دفن کرنے کا حکم ہے لیکن مزار شریف میں لاشوں کو گلنے سڑنے کیلئے چھوڑ دیا گیا تھا۔ کتے لاشوں کو کھاتے رہے۔ بدبو اتنی تھی کہ سانس لینا مشکل ہو گیا۔ عورتوں کی بے حرمتی کی گئی۔ ایک بیوہ نے بتایا کہ طالبان ہمارے گھر میں داخل ہوئے۔ انہوں نے پہلے میرے خاوند کو اور دو بھائیوں کو تین تین بار گولی ماری، اور اس کے بعد ان کے گلے اس طرح کاٹے جیسے جانوروں کو ذبح کیا جاتا ہے۔

پہلے دن کے بلاامتیاز قتل عام کے بعد انہوں نے شیعہ ہزارہ کو نشانہ بنانا شروع کیا۔ انہوں نے شہر کے رہائشی حکمت یار کی حزب اسلامی کے پشتونوں کو گائیڈ بنایا۔ وہ شہر کے گلی کوچوں سے اچھی طرح واقف تھے۔ اگلے چند روز تک حزب اسلامی والوں کی مدد سے ہزارہ کے گھروں پر حملے ہوتے رہے۔ ہزاروں ہزارہ افراد کو جیل میں لے جایا گیا۔ جب وہاں تل دھرنے کی جگہ نہ رہی تو ہزارہ

کو ٹینکوں میں بھرنا شروع کر دیا جہاں وہ دم گھٹنے سے مر جاتے۔ کچھ ہزارہ کو ٹینکروں میں ڈال کر صحرا لے جایا جاتا جہاں وہ گرمی اور حبس سے مر جاتے۔ 1997ء میں طالبان کے ساتھ دوستم نے بھی ایسا وحشیانہ سلوک کیا تھا، وہ گویا اس سے سیکھ کر یہ بربریت شیعہ ہزارہ پر آزمارہے تھے۔ طالبان نے ملا نیازی کو مزار شریف کا گورنر مقرر کیا۔ بچ جانے والے شیعوں کیلئے اعلان کیا گیا کہ یا تو وہ سنی مسلک اختیار کر لیں یا اپنا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر ایران چلے جائیں یا موت قبول کر لیں۔ شیعوں پر مساجد میں عبادت کرنے پر پابندی لگادی گئی۔ کوئی غیر جانبدار مبصر موجود نہیں تھا جو لاشوں کو گنتا۔ بعد میں اقوام متحدہ کے ادارے نے اندازہ لگایا کہ پانچ سے چھ ہزار نہتے شہری قتل کئے گئے۔

طالبان کا ایک چھوٹا سا گروہ ملا دوست محمد کی سربراہی میں ایرانی قونصل خانے میں داخل ہوا۔ اس نے ایرانی سفارت کاروں، انٹیلی جنس کے ایک افسر اور ایک صحافی کو تہہ خانے میں لے جا کر گولی مار دی۔ حکومت ایران نے کچھ عرصہ پہلے حکومت پاکستان سے درخواست کی تھی کہ ان کے قونصل کے تحفظ کی ضمانت فراہم کی جائے۔ ایرانی جانتے تھے کہ آئی ایس آئی کے افسر بھی طالبان کے ساتھ مزار شریف گئے ہیں۔ اسی بنا پر وہ اپنے سفارتی عملے کی

حفاظت کیلئے پاکستان کی مدد کے طالب تھے۔ طالبان پر سفارتی دباؤ بڑھا تو انہوں نے کہا کہ یہ چند گمراہ عناصر کی کاروائی تھی۔ ملا دوست محمد نے دو ہزارہ خواتین کو لونڈیاں بنالیا تھا۔ اسکی بیوی نے ملا عمر سے شکایت کی کہ وہ دو ہزارہ ''فاحشاؤں'' کو گھر لے آیا ہے۔ ملا دوست محمد کو بعد میں کسی الزام کے تحت جیل ڈال دیا گیا۔

اس کے بعد طالبان نے بامیان پر تین اطراف سے حملہ کر دیا اور 13 ستمبر 1998ء کو شہر پر قابض ہو گئے۔ کریم خلیلی اور حزب وحدت کے دوسرے رہنما شہر کی بیشتر آبادی کو ساتھ لے کر پہاڑوں کی طرف چلے گئے۔ اس مرتبہ نہتے شہریوں کے انسانی حقوق کے حوالے سے بین الاقوامی اداروں نے بہت شور کیا تو ملا عمر نے اپنے دستوں کو حکم دیا کہ وہ کسی جرم کا ارتکاب نہ کریں۔ اس کے باوجود طالبان کے شہر میں داخلے کے چند ہفتوں بعد تک قتل کے چھوٹے موٹے واقعات ہوتے رہے۔ بامیان کے ایک نواحی گاؤں میں 50 معمر افراد کو طالبان نے قتل کر دیا۔ جواں تو پہاڑوں میں چلے گئے تھے، پیچھے بوڑھے رہ گئے تھے جنھیں طالبان نے قتل کیا(40)۔

حوالہ جات

1. R. Thapar, “Early India”, p. 156–160, Penguin Books, (2003).
2. Ibid, p. 176.
3. Marcus Junianus Justinus, “Epitome of Pompeius Trogus”, Libre XLI 4 (5).
4. R. Thapar, “Early India”, p. 217, Penguin Books, (2003).
5. Ibid, p. 221.
6. Ibid, p. 280.
7. Ibid, p. 286.
8. L. Dupree, “Afghanistan”, pp.302 – 303, Princeton University Press, (1980).
9. T. Watters, “On Yuan Chwang's travels in India”, pp. 115 – 122, Royal Asiatic Society, London (1904).
10. http://hyecho-buddhist-pilgrim.asian.lsa.umich.edu/bamiyan.php
11. L. Dupree, “Afghanistan”, p.314, Princeton University Press, (1980).
12. N. Dupree, “Bamiyan”, p. 61–63, Afghan Tourist Organization, (1967).
13. L. Dupree, “Afghanistan”, p.317, Princeton University Press, (1980).
14. Z. M. Babur, “Babur-nama”, pp. 207, 214, 218, 221, 251–53, 300, Lahore (1987).

15. L. Dupree, “Afghanistan”, p.336, Princeton University Press, (1980).
16. ڈاکٹر مبارک علی، ”گمشدہ تاریخ“، صفحات 101 تا 107، فکشن ہاؤس لاہور، (2005)
۔
17. L. Dupree, “Afghanistan”, p. 409, Princeton University Press, (1980).
18. Hamza Alavi, “Ironies of History: Contradictions of the Khilafat Movement”, Comparative Studies of South Asia, Africa and the Middle East 17 (1): 1–16, (1997).
19. L. Dupree, “Afghanistan”, p. 418, Princeton University Press, (1980).
20. Hasan K. Kakar, “Government and Society in Afghanistan: The Reign of Amir Abd Al-Rahman Khan”, p. 158–161, University of Texas Press, (2011).
21. Ibid, pp. xxiii–xxiv.
22. L. Dupree, “Afghanistan”, p. 435, Princeton University Press, (1980).
23. Ibid, Ch. 20.

24. Hasan K. Kakar, “Government and Society in Afghanistan: The Reign of Amir Abd Al-Rahman Khan”, p. 250, University of Texas Press, (2011).
25. Jun Z. Li, et. al., “Worldwide Human Relationships Inferred from Genome-Wide Patterns of Variation”, Science, Vol. 319, Issue 5866, pp. 1100-1104, Feb. (2008).
26. B. Martínez-Cruz, et al., “In the heartland of Eurasia: the multilocus genetic landscape of Central Asian populations”, European Journal of Human Genetics, Vol. 19, pp. 216–223, (2011).
27. L. Dupree, “Afghanistan”, p. 435, Princeton University Press, (1980).
28. Ibid, p. 272.
29. R. Thapar, “Early India”, p. 181, Penguin Books, (2003).
30. L. Dupree, “Afghanistan”, pp. 286 – 288, Princeton University Press, (1980).
31. R. Thapar, “Early India”, p. 222, Penguin Books, (2003).

32. L. Dupree, “Afghanistan”, p. 305, Princeton University Press, (1980).
33. H. A. Giles, “The Travels of Fa Hsien”, pp. 7–8, Cambridge University press, (1923).
34. R. Thapar, “Early India”, p. 287, Penguin Books, (2003).
35. Tabari, “Tarikh-i Tabari”, IV, 263; VI, 2494.
36. محمد قاسم فرشتہ، ”تاریخِ فرشتہ“، جلد 1، صفحہ 81، عثمانیہ یونیورسٹی پریس، حیدر آباد (1926ء)۔
37. Yahia Baiza, “The Hazaras of Afghanistan and their Shi'a Orientation: An Analytical Historical Survey”, Journal of Shi'a Islamic Studies, vol. 7, no. 2, pp. 151 - 171, (2014).
38. ڈاکٹر مبارک علی، ”برصغیر میں مسلمان معاشرے کا المیہ“، صفحہ 45، (2005ء)۔
39. ڈاکٹر مبارک علی، ”سندھ کی تاریخ کیا ہے؟“، صفحہ 44، (2004ء)۔
40. احمد رشید، ”طالبان“، صفحات 114–129، مشعل بکس، لاہور (2011)